

اختر رضا سلیمی کے ناولوں کا نوآبادیاتی تناظر

Postcolonial perspective of Akhtar Raza Saleemi's Novels

By Khalid Mahmood Samtia, SSE Urdu, School Education Department, Layyah.

ABSTRACT

Frantz Fanon and Edward Said are the founders of Postcolonialism. In urdu literary world, it is a new style of criticism which has been introduced in the early years of 21st century. Postcolonialism analyzes, explains and responds to the cultural legacy of colonialism. Postcolonialism helps to discuss the struggle of characters for their specific cultural identities in the wake of colonization. Novel is such a unique multidimensional genre of literature that covers all aspects of life. Culture is an integral part of life. That's why culture is also an integral part of novel too. Akhtar Raza Saleemi is a prominent urdu novelist of 21st century. He is the first urdu novelist who introduced Hazarvi life and rituals in urdu novel. His both novels *Jaagehain Khawab mein* and *Jandar* specially focus the cultural activities of Hazara region in the post colonial context. Therefore, this research paper interprets the cultural aspects of novels of Akhtar Raza Saleemi in the lens of postcolonial criticism.

Key words: Colonialism, Postcolonialism, cultural identity, Frantz Fanon, Edward Said, Saleemi, Novel, Jaage Hain Khawab Mein, Jandar.

مابعد نوآبادیاتی مطالعات نوآبادیاتی خطوں کے ان ادبی متون کی تفہیم کا ایک نیا ڈسکورس ہیں جن کا اساسی

ایس ایس ای اردو اسکول ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ، لہ۔

موضوع 'گم شدہ ثقافتی حافظے' اور 'مقامی ثقافت' کی بازیافت ہے۔ مغرب نے مشرق کو نوآبادی بنانے کے لیے جو ڈسکورس وضع کیا اس میں ثقافتی یلغار کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نوآبادیات سے قبل ثقافت کو باقاعدہ ڈسکورس کی اہمیت حاصل نہیں تھی۔ جب اہل یورپ نے دنیا کے مختلف خطوں کو اپنی نوآبادی بنایا تو اس دوران انھیں بہت سی نئی اقوام کے نئے نئے رسم و رواج کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی ثقافتی اختلاط سے ثقافت کے مجرد تصور نے جنم لیا۔^(۱)

کسی بھی ثقافت کی تشکیل میں مذہب، رسم و رواج، زبان، اساطیر، توہمات و تعصبات، فکری و جذباتی رشتے، شاندار ماضی، شادی بیاہ کی رسومات، مذہب کی صحت مند روایات، تہوار، مقامی کھانے اور لباس، شعر و ادب کی روایات، زندگی اور زندگی کے مسائل و مظاہر کو دیکھنے کے خاص انداز اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ایک ثقافت صدیوں کی مسافت طے کرنے کے بعد خاص شناخت اور پہچان حاصل کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ ثقافت جامد نہیں ہوتی، دیگر ثقافتوں سے بھی اپنے مزاج سے ہم آہنگ اثرات قبول کرتی ہے یعنی مسلسل ارتقا پذیر رہتی ہے لیکن سفر کے ہر موڑ پر اپنی روح میں خاص ثقافتی شناخت ضرور رکھتی ہے جو اسے دوسری ثقافتوں سے ممیز کرتی ہے۔ یہی 'خاص ثقافتی شناخت' کھوجائے تو ثقافت اپنا وجود برقرار نہیں رکھ پاتی۔ ہر قوم کا اپنی ثقافت کے ساتھ ذہنی و جذباتی رشتہ ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ اس کے لاشعور کا بھی حصہ بن جاتی ہے۔ جب تک کوئی قوم اپنی ثقافتی اقدار اور تاریخ کے ساتھ جڑی رہتی ہے اور اسے دیگر ثقافتوں سے برتر سمجھتی ہے، اس وقت تک وہ کسی دوسری قوم اور اس کی ثقافتی اقدار سے مرعوب نہیں ہوتی اور نہ ہی ذہنی غلامی قبول کرتی ہے۔ اپنی ثقافت کو کم تر سمجھنا اور دوسری ثقافتوں سے مرعوب ہونے کا مطلب ذہنی غلامی ہے۔ استعمار کاروں کو ان امور کا بخوبی علم تھا اس لیے انھوں نے نوآبادیاتی ڈسکورس میں ثقافتی یلغار کو مرکزی اہمیت دی۔ ثقافتی یلغار نوآبادیات کی تین مرکزی خصوصیات میں سے ایک ہے۔

It has been argued that, despite its institutional variation, colonialism typically displays three characteristics: domination, exploitation and cultural imposition.⁽²⁾

نوآبادیات مشرقی دنیا کو مغربی معیاروں سے جانچنے کا نام ہے۔ اس میں مشرق کی تعبیر مغرب کے علم سے حاصل کی جاتی ہے اور اس تعبیر کی روشنی میں مغرب کا اعلیٰ و ارفع تصور قائم کیا جاتا ہے، جبکہ مابعد نوآبادیات میں اس آگاہی کا پردہ چاک کرنے کے ساتھ ساتھ مشرق کو اپنے تصور کائنات کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کی جاتی

ہے۔ نوآباد کار نے یہاں کے وسائل لوٹنے اور اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے جو 'بیانیہ' تشکیل دیا، مابعد نوآبادیاتی تنقید اسی 'بیانیہ' کے مقامی ادب و ثقافت پر اثرات کا مطالعہ کرتی ہے۔

نوآباد کار پہلے پہل برصغیر میں تجارت کی غرض سے آئے اور یہاں کے مقامی باشندوں میں رچ بس گئے۔ یہاں کی تہذیب و ثقافت، زبان و ادب اور رسم و رواج کا گہرائی سے مطالعہ کیا تاکہ یہاں کے لوگوں کے دلوں پر راج کر سکیں۔ ثقافتی یلغار کے سلسلہ میں استعمار کار نے تین امور کو خصوصی اہمیت دی۔ ثقافتی قلب یعنی زبان اور مقامی رسم و رواج کو برتر مغربی جدید تہذیب و ثقافت کی نظر سے دیکھا اور اپنی ثقافت کے مقابلے میں اسے کم تر اور غیر مہذب قرار دیا۔ اس کے علاوہ خصوصی نصابات کے ذریعے مقامی باشندوں میں سے ایسی نسل تیار کی جو رنگ و نسل کے لحاظ سے مقامی اور سوچ اور فکر کے لحاظ سے استعماری سوچ رکھتے تھے۔ استعمار کار نے مقامی ثقافت کو کم تر ثابت کرنے اور اپنے اقتدار کو وسعت دینے کے لیے اس نسل کو بطور ہتھیار استعمال کیا۔

برصغیر کو نوآباد کاروں (انگریزوں) نے اپنی تجارتی اور سیاسی حکمت عملی سے اپنی کالونی بنانے کے لیے سب سے پہلے یہاں کی تہذیب و ثقافت اور زبان سیکھی۔ آہستہ آہستہ یہاں کی مقامی آبادی (ہندستانیوں) کو یہ باور کرایا کہ ان کی تعلیم، زبان اور ثقافت پسماندہ، قدیم، غیر متمدن اور غیر مہذب ہے۔ انگریزوں (استعمار کار) کی زبان، تعلیم اور ثقافت جدید، متمدن اور مہذب ہے۔ اگر وہ زندگی میں ترقی، خوش حالی اور اعلیٰ ملازمتوں کے خواہش مند ہیں تو جدید تعلیم حاصل کریں۔ اس مقصد کی خاطر استعماری طاقتوں نے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت ایسا نصاب تیار کیا جس کے ذریعے یہاں کے اذہان پر بھی حکومت قائم کی جاسکے۔ اس مکارانہ سوچ کے ذریعے یہاں کی مقامی آبادی کو استعمار کاروں نے اپنا ذہنی غلام بنالیا۔ مقامی باشندے اپنی تہذیب و ثقافت، تمدن اور رسم و رواج کو فرسودہ خیال کرنے لگے اور ان سے نفرت کرنے لگے۔ وہ انگریزوں کی تہذیب و ثقافت اور جدید علوم سے متاثر و مرعوب ہو کر اپنے آپ کو استعمار کاروں کے رنگ میں رنگنے لگے۔ اس طرح استعمار کار نے اپنی سیاسی حکمت عملی کے ذریعے یہاں کے مقامی باشندوں کے ذہنوں میں جن اقدار سے نفرت کا بیج بویا، ان میں خاص طور پر یہاں کی ثقافت تھی۔

استعمار کاروں کے ان حربوں، بیانیوں اور کلامیوں کو سب سے پہلے فرانز فینن (Frantz Fanon)^(۳) اور ایڈورڈ سعید (Edward Said)^(۴) نے نشان زد کیا۔ انھوں نے اس راز سے پردہ اٹھایا کہ مغرب نے مشرق پر ثقافتی یلغار کس مقصد کے تحت اور کیوں کی؟ ان مفکرین کے نظریات کی روشنی میں ادب کے مابعد نوآبادیاتی مطالعہ کا رواج ہوا۔ چونکہ ادب کسی معاشرے، زندگی اور اس کی تہذیب و ثقافت کا امین اور سچا عکاس

ہوتا ہے، اس لیے ادب کے مابعد نوآبادیاتی مطالعہ پر خاص طور پر زور دیا گیا اور اس مطالعہ میں ثقافت کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی تاکہ مابعد نوآبادیاتی باشندوں (مقامی آزاد باشندوں) کے ذہنوں میں دوبارہ اپنی ثقافت کی اہمیت واضح کی جاسکے۔ نئی، جدید استعماری ثقافت اور پرانی یعنی مقامی ثقافت کے درمیان موجود فرق کو واضح کیا جاسکے اور اپنی اصل ثقافت کی بازیافت کی جاسکے۔ ناصر عباس نیئر کے الفاظ میں مابعد نوآبادیاتی مطالعہ ثقافت اور فکر کو استعمار کی مخفی اور عیاں زنجیروں سے رہائی دلاتا ہے۔^(۵) یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر ادبی متن کا مابعد نوآبادیاتی مطالعہ کیا جاسکتا ہے؟ آسان اور مختصر ترین جواب تو 'نہی' میں ہے۔ یعنی جس طرح ہر ادبی متن کا نفسیاتی مطالعہ ممکن نہیں، بالکل اسی طرح ہر ادبی متن کا مابعد نوآبادیاتی مطالعہ بھی کیا جاسکتا۔ مابعد نوآبادیاتی مطالعہ فقط ان متون کا کیا جاسکتا ہے جن میں استعمار کار/نوآباد کار کے کردار اور نوآبادیاتی بیانیوں اور کلامیوں کو بے نقاب کیا گیا ہو۔ نیز استعماری ثقافت اور مقامی ثقافت کی کش مکش ادبی متن میں موجود ہو۔ نوآبادیاتی نظام کی جدید صورت 'عالم گیریت' ہے جو نئے انداز کی 'ثقافتی یلغار' ہے۔ عالمگیریت کا مرکزی ہدف بھی غریب ممالک کی مقامی ثقافتیں ہیں۔ 'آزادانہ تجارت' اور 'عالمی گاؤں' کے نام پر مقامی ثقافتوں کو ایک بار پھر مٹانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس مرحلے پر جہاں مقامی ثقافتوں کی اہمیت بڑھ جاتی ہے وہاں ادیب کی ذمہ داری بھی بڑھ جاتی ہے کہ وہ اپنی مقامی ثقافت کو اپنی تخلیقات کا حصہ بنائے اور قوم میں شاندار ماضی اور ثقافتی شناخت کی اہمیت اجاگر کرے۔

ناول بقول ڈی ایچ لارنس زندگی کی روشن کتاب ہے جو زندگی کے تمام مظاہر بشمول ثقافت کو اپنا حصہ بناتا ہے۔ ناول اور ثقافت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ناول کا اساسی موضوع جو بھی ہو، ثقافت اس میں ایک اہم بلکہ مرکزی جزو کے طور پر شامل ہوتی ہے۔ رالف فاکس کے مطابق ناول نگار کو تاریخی شعور کے ساتھ ساتھ اپنی قوم کے ثقافتی ورثے کو بھی استعمال کرنے کا اہل ہونا چاہیے۔ یہ دونوں باتیں آپس میں بے انتہا گھلی ملی ہیں۔ انھوں نے سیاسی ماضی سے زیادہ ثقافتی ماضی کو اہمیت دی ہے کہ اگر لوگ سیاسی ماضی کے ساتھ ثقافتی ماضی سے بھی دستبردار ہو جائیں تو وہ تاریخ میں کوئی اہم کردار ادا نہیں کر سکتے۔^(۶)

اردو ناول کا آغاز بھی نوآبادیاتی دور میں ہوا۔ اس لیے اردو ناول میں نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی دونوں طرح کی صورت حال کی عکاسی موجود ہے۔ نوآبادیاتی دور کے اثرات جس طرح ناول میں اظہار پاسکتے ہیں شاید ہی کسی دوسری صنف میں ایسا ممکن ہو۔ استعماری کشمکش کے حوالے سے اردو کے پہلے ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد کے دو ناول 'توبہ النصوح' اور 'ابن الوقت' خاص طور پر اہم ہیں۔ اسی طرح شرار اور سرشار کے ناولوں میں بھی ثقافتی کش مکش موجود ہے۔ اکیسویں صدی میں اردو ناول نے مقامی ثقافت کی پیش کش پر خصوصی توجہ دی ہے۔ اختر

رضاسیلی بھی اکیسویں صدی کے اہم ناول نگار ہیں اور ان کے ناولوں کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ شاندار ماضی اور مقامی ثقافت کی بازیافت اور تشکیل نوان کا اساسی موضوع ہے۔ سلیمی اردو کے پہلے ناول نگار ہیں جنہوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے اردو داں طبقے کو ہزاروی تہذیب و ثقافت سے روشناس کرایا۔ اس سے قبل اردو ناول کا قاری اس خوب صورت جغرافیائی خطے کی ثقافت سے روشناس نہیں تھا۔ ان کے دونوں ناولوں میں ہزاروی ثقافت اور اس کے مختلف مظاہر کی پیش کش قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ تاہم انہوں نے مابعد نوآبادیاتی تناظر میں اپنی ثقافت (ہزاروی ثقافت) کی بازیافت کی کوشش کی ہے۔ وہ استعماری حربوں، ان کے اثرات اور مضمرات سے بخوبی آگاہ ہیں، اس لیے استعماری صورت حال اور نوآبادیاتی اثرات کو ناول کے بیانیہ کا حصہ کمال مہارت سے بنایا ہے۔ اختر رضاسیلی کے دونوں ناولوں میں استعمار کار (انگریز) کا کردار بھی موجود ہے جو استعماری سوچ کا آئینہ دار ہے۔ مقامی نوجوان نسل کے ایسے افراد بھی جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے مقامی اور ذہن اور سوچ کے اعتبار سے استعماری فکر کے مداح ہیں۔ جبکہ مرکزی کردار اپنے شاندار ماضی، ثقافتی اقدار اور رسم و رواج سے جڑے ہوئے ہیں۔ سلیمی نے ناول ”جاگے ہیں خواب میں“ میں کئی سطح پر استعماری اور مقامی ہزاروی ثقافت کی کش مکش اور پُر شکوہ ماضی کو اجاگر کیا ہے جبکہ ناول ”جندر“^(۷) میں یہ کش مکش ایک لحاظ سے مزاحمت کی صورت اختیار کر گئی ہے۔

ناول ”جاگے ہیں خواب میں“ میں پہلی سطح نوآباد کار کردار کی پیش کش ہے۔ اس ناول میں انگریز آفیسر جیمز ایبٹ کا کردار خالص استعمار کار کا کردار ہے جو استعماری سوچ کا آئینہ دار ہے۔ فرانز فینن کہتا ہے کہ نوآباد کار مقامی باشندوں کے سامنے اپنے آپ کو مسیحا اور نجات دہندہ کے روپ میں پیش کرتا ہے۔ برصغیر کی نوآبادیاتی صورت حال کے تناظر میں دیکھیں تو نوآباد کاروں نے یہاں کے مقامی باشندوں کے ذہنوں میں جو اپنا پہلا امیج بنایا وہ ”مسیحا“ کا تھا۔ جب جیمز ایبٹ ہری پور، ہزارہ اور ایبٹ آباد کے علاقوں کی مقامی آبادی کو اپنا مطیع بنانا چاہتا ہے تو وہ ان علاقوں کی عوام سے لڑنے کے بجائے یہاں کے جری، بہادر اور بارسوخ سورماؤں اور دیگر بااثر افراد اور برادریوں کے سرداروں کو اپنی استعماری حکمت عملی، تدبیر کاری اور حسن سلوک سے اپنا مطیع بناتا ہے، انہیں نوازتا ہے اور ان کے ذریعے پورے علاقے میں نہ صرف امن قائم کرتا ہے بلکہ استعماری/سامراجی اقتدار کو بھی پائیداری بخشتا ہے۔

ایبٹ عام لوگوں میں بہت جلد گھل مل جاتا تھا، وہ ہر آدمی کی شکایات پوری توجہ سے سنتا اور اس کے ازالے کی پوری کوشش کرتا تھا۔ اس لیے دو سالوں کے مختصر عرصے

میں اس نے سکھوں کے مظالم سے تنگ آئے ہوئے لوگوں کے دل جیت لیے۔^(۸)

ریزیڈنٹ پشاور، ڈپٹی کمشنر ہزارہ جیمز ایبٹ کی سالانہ کارکردگی رپورٹ ان الفاظ میں لکھتا ہے۔ یہ رپورٹ استعماری سوچ اور استعماری ڈسکورس کی بھرپور آئینہ داری کرتی ہے:

لوگ اس کی پرستش کرتے ہیں۔ گزشتہ سال میں جتنے بھی لوگ ہزارہ سے میرے پاس آئے، انھوں نے اس کی بے حد تعریف کی۔ وہ اس قوم سے ہر کام حسب خواہش لے سکتا ہے۔ جس قوم کو سکھ اپنے پورے عہد حکومت میں فوج کے ذریعے بھی رام نہ کر سکے اور جس کو ہوشیار و چالاک راجا گلاب سنگھ نے بھی ہر شرط پر واپس دربار کے حوالے کرنا منظور کیا۔ اس قوم کو میجر ایبٹ نے اپنی خوئے دل نوازی سے رام کر لیا۔^(۹)

جیمز ایبٹ ہری پور میں امن قائم کرنے کے لیے ناول کے مرکزی کردار زمان خان کے جد امجد نور خان سے جمعہ خان کے ذریعہ رابطہ کرتا ہے اور اپنی خوئے دل نوازی سے اسے رام کر لیتا ہے (یہ خوئے دل نوازی بھی استعماری اسلوب کی آئینہ دار ہے۔) لیکن نور خان کی زندگی وفا نہیں کرتی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا فقیر محمد اپنے والد کا وعدہ نبھاتا ہے اور اپنی پوری قوم کو انگریز سرکار کا مطیع بنا دیتا ہے۔ اس کے بدلے میں انگریز سرکار نے بھی فقیر محمد کو خوب نوازا۔ اس کے لیے نور آباد میں شاندار حویلی تعمیر کرائی گئی۔ جس کے تعمیراتی میٹرل کی ترسیل کے لیے باقاعدہ سڑکیں بنائی گئیں اور گلیات کے جنگلات سے لکڑی لائی گئی۔ نور آباد میں سکول قائم کیا گیا۔ فقیر محمد خود بڑے درویش منش انسان تھے۔ وہ بستی کے دیگر افراد کے ساتھ اپنے کچے مکان میں رہتے تھے لیکن حویلی کی تعمیر اس لیے کی گئی تاکہ عام عوام اور انگریزوں کے خاص وفاداروں کے درمیان امتیاز قائم کیا جاسکے۔ مقامی باشندوں پر رعب و دبدبہ بڑھایا جاسکے اور مقامی ثقافت کو بدلا جاسکے۔ طبقاتی تقسیم کے ذریعے امیر اور غریب میں فرق قائم کیا جاسکے۔ مقامی باشندوں کو دکھایا جاسکے کہ جو انگریز سرکار (استعمار کار) کی اطاعت قبول کر لیتے ہیں انھیں انعام و اکرام کے ذریعے خوب نوازا جاتا ہے۔ جب یہ حویلی تیار ہوئی تو ہزارہ کے دوسرے ڈپٹی کمشنر میجر آراڈمز اس کے افتتاح کے لیے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ تشریف لائے تاکہ مقامی لوگوں میں نوآباد کار رعب بڑھاسکیں اور مقامی باشندوں کو مرعوب کر سکیں۔ ان کا شایان شان استقبال کیا گیا۔ علاقے کے سب سے بارسوخ مقامی سردار فقیر محمد نے خود آگے بڑھ کر انھیں سواری سے اترنے میں مدد دی اور انھیں حویلی کے بڑے دروازے پر لے کر آئے۔ یہاں میجر صاحب نے فیتہ کاٹ کر حویلی کا افتتاح کیا۔ حویلی کی تزئین و آرائش کے لیے مقامی پودوں

کے بجائے کیکٹس کے پودے لگائے گئے۔^(۱۰)

دوسری سطح جسے ناول نگار نے اپنے ناول میں پیش کیا ہے وہ مقامی نوجوان نسل کی تعلیم کے ذریعے ذہن سازی ہے۔ استعمار کار نے مقامی نوجوان نسل کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے تعلیمی ڈسکورس وضع کیا اور ایسے نصاب ترمیم دیئے جن کے ذریعے ایسے اذہان پیدا کیے جائیں جو رنگ و نسل کے لحاظ سے مقامی اور سوچ کے لحاظ سے استعماری فکر کے آئینہ دار اور مغربی تہذیب و ثقافت کو فروغ دینے والے ہوں۔ اس سارے عمل میں نوآباد کار نے اس بات کی ہر ممکن کوشش کی کہ ایسے اذہان تیار کیے جائیں جو اپنے شاندار ماضی اور ثقافتی اقدار سے نفرت کریں اور جدید استعماری ثقافت کے مداح ہوں۔ تاکہ مقامی باشندوں کو ان کے شاندار ماضی اور ثقافتی شناخت سے کاٹ دیا جائے۔

کوئی نوجوان آدمی، خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، ہمارے اینگلو انڈین سکولوں سے جب نکلتا ہے تو اپنے آبائی اعتقادات پر بے یقینی سیکھ چکا ہوتا ہے۔ ایشیا کے فراوان تخیلی مذاہب کا سامنا جب مغربی سائنس کی سر حقیقتوں سے ہوتا ہے تو وہ خشک بیت میں سکڑ کر رہ جاتے ہیں۔^(۱۱)

ناول ”جاگے ہیں خواب میں“ کا ایک کردار کاظم خان بھی ایک ایسا ہی کردار ہے۔ کاظم خان جو ظفر علی خان کا بیٹا اور فقیر محمد کا پوتا ہے، انگلستان سے جدید تعلیم یافتہ ہے۔ وہ اپنے والد ظفر علی خان کو، جسے بستی کے بیشتر لوگ ولی اللہ سمجھتے ہیں اور اس کی قبر پر مزار بنا کر وہاں باقاعدہ عرس بھی کراتے ہیں۔ شیر و فرینیا کا مریض کہتا ہے اور اس سارے ثقافتی سلسلہ کو سخت ناپسند کرتا ہے، اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کی نظر میں یہ رسوم فرسودہ اور جہالت پر مبنی ہیں جن کی کوئی عقلی توجیہ نہیں کی جاسکتی۔ حالاں کہ یہ رسوم ان علاقوں میں صدیوں سے رائج ہیں اور مقامی باشندے ان کے ساتھ نفسیاتی، ذہنی و جذباتی وابستگی رکھتے ہیں۔ استعماری طاقتوں کا یہ ایک حربہ تھا کہ انھوں نے یہاں کے محکوم ذہنوں کو مرعوب کیا۔ نوجوان نسل کو جدید تعلیم کے ذریعے اپنی تہذیب و ثقافت کے ساتھ نفرت کرنا سکھایا۔ کاظم خان جدید تعلیم یافتہ ہے اور نوآبادیاتی سوچ کا حامل ہے۔ اس لیے اپنی ثقافتی اقدار کو ناپسند کرتا ہے۔

مقامی ثقافت کی بازیافت کی تیسری سطح مقامی رسم و رواج ہیں جن میں عرس، میلے اور شادی بیاہ کی تقریبات کے ساتھ ساتھ موت کے بعد تجہیز و تکفین کی رسومات کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔ عرس اور میلے بھی اہم ثقافتی سرگرمیاں ہیں۔ استعماری حکمران ان ثقافتی سرگرمیوں کو نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور اپنے ہم خیال مقامی

باشندوں اور یہاں کی نوجوان نسل جس نے جدید مغربی تعلیم حاصل کی، ان کے ذہنوں میں مقامی ثقافتی مظاہر کے خلاف نفرت کا بیج کمال مہارت سے بویا اور مقامی ثقافتی مظاہر کو مغرب کے زاویہ نظر سے دیکھنے کی ترغیب دی۔ ان اثرات کے نتیجے میں جدید نوجوان نسل مغربی استعمار کار کا آلہ کار بن کر اپنی اقدار کو نفرت سے دیکھنے لگے۔ کاظم خان چوں کہ مغربی تعلیم اور استعماری سوچ اور ثقافت سے متاثر ہے اس لیے وہ ان سرگرمیوں کے خلاف ہے لیکن اس کی وفات کے بعد اس کے چھوٹے بھائی جعفر خان نے ظفر علی خان کے سالانہ عرس اور میلے کی اجازت دے دی کیوں کہ وہ جدید مغربی تعلیم یافتہ نہیں ہے اور نہ ہی مغربی ثقافتی اقدار سے مرعوب ہے بلکہ اپنی مقامی ثقافتی اقدار کا مداح ہے۔ ناول نگار نے ناول ”جاگے ہیں خواب میں“ میں ظفر علی خان کی شادی کے موقع پر ہزارہ تہذیب کی ثقافتی سرگرمیوں کو تفصیل سے اجاگر کیا ہے۔ نیز مرکزی کردار زمان اور اس کی والدہ کی وفات اور بستی نور آباد میں ہونے والی اولین اموات کی تجہیز و تکفین کی رسومات کو بھی پوری جزئیات اور ثقافتی تفاخر کے ساتھ پیش کیا ہے۔

ناول کا مرکزی کردار زمان جدید تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود جدید تعلیم سے مرعوب نہیں ہے۔ وہ شہری زندگی کو چھوڑ کر گاؤں میں رہائش پذیر ہو جاتا ہے۔ درحقیقت اس کا یہ عمل اس کے اجتماعی لاشعور کی وجہ سے ہے لیکن جب مابعد نوآبادیاتی تناظر میں اس کردار کا جائزہ لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ زمان اپنے ابا و اجداد کی نشانیوں اور خاندان کی عظمت سے جڑا ہوا ہے۔ وہ اپنے گمشدہ ماضی اور ثقافتی شناخت کی بازیافت چاہتا ہے۔ جدید دنیا سے اسے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ ایک لحاظ سے جدید دنیا سے کٹ چکا ہے۔ اس کا حال اور مستقبل اس کا ماضی اور خاندان ہے۔ اس کے لیے مستقبل سے زیادہ ماضی اہم ہے۔ اس کے ہاں شناخت کا بحران ثقافتی شناخت کے المیہ سے جنم لیتا ہے۔ وہ بار بار اپنے آپ سے سوال کرتا ہے کہ میں کہاں ہوں؟ اور کن لوگوں کے درمیان ہوں؟ اسے نور آباد جانا ہے، ماضی کے نور آباد جسے اس کے اسلاف نے بسایا تھا۔ جو جدید ثقافتی یلغار اور رویوں سے پاک تھا، نہ کہ اس نور آباد میں جو جدید ثقافتی اختلاط کے نتیجے میں ابھر کر سامنے آیا ہے۔ وہ اشوک اعظم کے زمانے میں پلٹنا چاہتا ہے کیوں کہ اس زمانے اس کی مقامی ثقافتی شناخت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہی تھی جو کسی بیرونی ثقافت سے مرعوب نہیں بلکہ اپنے اجزا میں خود کفیل و کامل اور دیگر ثقافتوں کو مرعوب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ زمان کا مابعد نوآبادیاتی رویہ ہی ہے جس کے باعث وہ جبراً ایبٹ سے کسی قسم کی شناخت قائم نہیں کرتا بلکہ اشوک اعظم کے زمانے کے ایک شخص سے شناخت قائم کرتا ہے۔ وہ اپنے شاندار ماضی اور گم شدہ ثقافتی حافظے کی بازیافت چاہتا ہے۔ ایسے ہی ایک پہلو کی نشاندہی ہیری سپیرو نے اپنی کتاب ثقافت کا مسئلہ میں بھی کی ہے۔ وہ

لکھتے ہیں:

واشنگٹن اور جیفرسن کا دل آج کے زمانے کی نسبت قدیم روم میں زیادہ
لگتا، کیوں کہ اُن کے بعد ثقافت میں بہت تیزی سے تبدیلی ہوئی ہے اور ان کا
زمانہ ثقافتی طور پر قدیم روما کے قریب اور ہم سے دور تھا۔^(۱۲)

سلیسی نے دریائے ہر کو کو بھی ایک ثقافتی علامت کے طور پر ناول کے بیانیے کا حصہ بنایا ہے۔ یہ دریا بھی
اپنی دھرتی کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ جیسے یہاں کے مقامی باشندے خوانخوار نہیں اور نہ ہی ناحق کسی کا خون کرنے
والے ہیں۔ مقامی باشندوں کے مانند دریائے ہر کو بھی ’لہو‘ کے بجائے یہاں کے مقامی پھلوں اور شہد کے ذائقے
سے بھرپور ہے اور مقامی ثقافت، شرافت اور مزاج کا آئینہ دار ہے:

”میں ہر وہوں

ہزاروں برس سے یونہی اپنی رو میں بہہ جا رہا ہوں
مری اور گلیات کی چھاتیوں سے نکلتی ہوئی دودھیا آبشاریں
مرے ظرف کو آزماتی رہی ہیں
مگر میں نے اپنے کنارے پہاڑ ایتادہ رکھے
تاکہ چاہوں بھی، تو اپنے آپ سے باہر نہ ہو پاؤں میں
قسم ہے زمانے کی
میں نے کسی بھی زمانے میں اپنے کنارے پہ آباد گاؤں اجاڑے نہیں
سومرے پانیوں میں لہو کا نہیں
سیب و شہوت و زیتون و انجیر کا ذائقہ ہے
مرے ساحلوں پر دیودار اور چیر کی خوشبوئیں تیرتی ہیں
میں گنگا نہ جمنانہ نیل و فرات ...
ایک گم نام دریا ہر وہوں ہر وہوں
مقدس صحیفے مرے تذکرے سے تہی ہیں
کہ میں نے کسی بھی زمانے میں انسانی جانوں کا نذرانہ مانگا نہیں
داستانوں میں میرا حوالہ نہیں

کہ میں نے کسی سوہنی کو ڈبویا نہیں
اور تاریخ کی سب کتابیں مرے باب میں چپ
کہ میری روانی میں پن چکیوں کی حسیں گونج ہے اعطش العطش کی صدائیں نہیں
تشنگی پیتے ہونٹوں کی آہیں نہیں^(۱۳)

جب کوئی ثقافت معدوم ہونے لگتی ہے یا موت سے ہم کنار ہوتی ہے تو یہ فقط ثقافت کی موت نہیں ہوتی بلکہ اس سے جڑے افراد کی بھی موت ہوتی ہے۔ یہی موضوع ہے اختر رضا سلیمی کے دوسرے ناول جندر کا۔ ’جندر‘ جو ثقافتی علامت بھی ہے، جندرونی ولی خان کے اجداد کی شجاعت کی نشانی بھی اور شاندار ماضی کی تاریخ بھی۔ جب اس کی ہوک کوک میں بدلتی ہے اور جندر لمحہ بہ لمحہ موت سے ہم آغوش ہونے لگتا ہے تو ولی خان بھی اسی رفتار سے اپنے آپ کو موت سے ہم آغوش ہوتے محسوس کرتا ہے۔ چوں کہ اس کے وجود کا جواز اس جندر یعنی ثقافتی علامت کی بقا میں ہے۔ اس لیے وہ جندر سے قبل خود موت سے ہم کنار ہونا چاہتا ہے۔

ناول ’جندر‘ کی کہانی چوں کہ جندر کے گرد گھومتی ہے اور جندر بذاتِ خود ہری پور، ہزارہ کی تہذیب و ثقافت کا لازمی جزو ہے۔ اس لیے اس ناول میں ہری پور، ہزارہ کی تہذیب و ثقافت کو بھرپور انداز میں اجاگر کیا گیا ہے۔ برصغیر کے نوآبادی بننے سے پہلے یہاں کی زندگی کیسی تھی، نوآبادی بننے کے بعد اور خاص طور پر مشینی و صنعتی انقلاب نے اس علاقے کی تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی زندگی کو کس کس انداز میں متاثر کیا؟ اس ناول میں ان تمام پہلوؤں کو نشان زد کیا گیا ہے۔ دو مثالیں ملاحظہ ہوں:

بابا جمال دین بتایا کرتا تھا کہ وہ یہاں سے ہر ہفتے انگریز افسروں کو گزرتے ہوئے دیکھا کرتا تھا جو کبھی کبھار، سستانے کے لیے یہاں — جندر کے پچھواڑے موجود کا ہو کے صدیوں پرانے درخت کے نیچے — رکا بھی کرتے تھے، ان کے ساتھ کچھ مقامی سپاہی بھی ہوتے تھے جو گھوڑوں کے پیچھے پیچھے پیدل چل رہے ہوتے تھے۔ واپسی پر بعض دفعہ ان کے ساتھ وہ ملزم بھی ہوتے جو سرکاری درخت، بغیر پرمٹ کے کاٹتے ہوئے پکڑے جاتے تھے۔ ان ملزموں کے دونوں ہاتھوں میں لوہے کی ہتھ کڑیاں ہوتیں، جن کے دوسرے سرے گھوڑوں کی زین میں بندھے ہوتے تھے، نیکریں پہنے مقامی سپاہی ہاتھوں میں ڈنڈے لیے گھوڑوں کے ساتھ ساتھ انھیں بھی ہانک رہے ہوتے تھے۔

افسروں کے گھوڑوں پر تو انھیں ڈنڈے برسانے کی جرات نہیں ہوتی تھی البتہ جب کبھی کوئی بھگوڑا (ملزم) تھک کر ہانپنے لگتا تو وہ اس پر خوب ڈنڈے برساتے اور اپنے افسروں کی خوشنودی کا سامان کرتے۔ انگریزوں کے یہاں سے چلے جانے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا، اس فرق کے ساتھ کہ اب گھوڑوں پر اکڑ کر بیٹھنے والے افسر بھی ویسی ہی رنگت کے مالک ہوتے تھے، جیسے تھکڑیاں ہاتھوں میں ڈالے گھوڑوں کے پیچھے پیچھے گھسیٹے جانے والے ملزم۔ ہاں خاکی رنگ کی نیکریں پہنے سپاہیوں کی جگہ؛ اب ٹخنوں کو چھوتی، خاکی رنگ کی پینٹ اور پورے بازوؤں والی شرٹ میں ملبوس سپاہیوں نے لے لی تھی۔^(۱۴)

جب سے وہ افسر بنا ہے اسے کئی لوگوں کی طرف سے طعنے مل رہے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب کچھ عرصہ پہلے مجھے دے کا شدید دورہ پڑا اور وہ مجھے یہاں سے شہر لے گیا تو ڈاکٹر کے پاس جاتے ہوئے اس نے مجھ سے نظریں چراتے ہوئے کہا تھا کہ ابا ڈاکٹر صاحب کو یہ نہ بتانا کہ آپ جندروئی ہیں۔ میں اس کی پریشانی سمجھ گیا تھا اور میں نے گردن ہلا کر فوراً ہامی بھری تھی۔ آج یہاں مرتے ہوئے مجھے اس بات کی خوشی بھی ہو رہی ہے کہ آئندہ میرے بیٹے کو کبھی اس طرح کی صورت حال کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔^(۱۵)

راحیل کا اپنے باپ سے 'نظریں چرانا' اور اپنے باپ کے پیشے کو نفرت کی نظر سے دیکھنا درحقیقت اپنی ثقافتی شناخت، ثقافتی اقدار اور ماضی سے نظریں چرانا ہے۔ جندرا اس کے خاندان کی شجاعت کی علامت ہے۔ ولی خان کا جندروئی ہونا اس کے لیے فخر کی علامت ہے کہ وہ اپنے پرکھوں کی نشانی کا وارث ہے۔ لیکن ولی خان کے برعکس راحیل جدید تعلیم یافتہ ہے۔ شہر میں رہائش پذیر ہے اور اپنے والد کے جندروئی ہونے پر سخت نالاں ہے اور وہ اس بات پر سخت شرمندگی محسوس کرتا ہے کہ اس کا باپ ایک جندروئی ہے۔ حالاں کہ جندروئی ہونا کوئی بری بات نہیں۔ یہ تو ہری پور اور اس کے گردونواح کے علاقوں کی تہذیب کا حصہ ہے اور جندرا ایک اہم ثقافتی علامت ہے۔ جسے راحیل نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ دراصل راحیل نوآبادیاتی سوچ کا حامل کردار ہے۔ نوآبادیاتی سوچ کا پروردہ اور جدید ثقافت کا مداح ہے۔ ولی خان اور راحیل کے کردار کے ذریعے ناول نگار نے روایتی یا قدیم اور جدید ثقافت کے درمیان کشمکش کو بیان کیا ہے۔ ولی خان اپنی ثقافت کی بازیافت چاہتا ہے جب کہ راحیل کے لیے

ان ثقافتی اقدار میں کوئی دلکشی نہیں بلکہ وہ انھیں فرسودہ خیال کرتا ہے۔ وہ ان اقدار کو مغربی برتر ثقافتی کے تناظر میں دیکھتا ہے تو یہ اقدار اسے ہیچ نظر آتی ہیں۔ اسی لیے ولی خان سوچتا ہے کہ جب اس کی وفات کے بعد اس کے بیٹے کو اسلام آباد سے یہاں گاؤں میں تجمیز و تکفین کے لیے آنا پڑے گا اور یہاں کی رسوم کو ناچاہتے ہوئے بھی ادا کرنا پڑے گا تو اس کے لیے یہ سب کچھ کس قدر مشکل ہوگا۔

اس ناول کا اساسی موضوع چوں کہ مٹی تہذیبی و ثقافتی اقدار کا نوحہ ہے۔ اس لیے اس ناول میں سلیمی نے بطور خاص یہاں کی تہذیبی و ثقافتی زندگی اور رسم و رواج کو اجاگر کیا ہے۔

زبان بھی ایک اہم ثقافتی مظہر ہے۔ استعمار کار نے ثقافتی یلغار کے لیے جو بیانیہ تشکیل دیا اس میں زبان کو کلیدی حیثیت حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ناول کو روایت میں آغاز ہی سے جہاں جہاں ثقافتی کش مکش اور استعماری بیانیہ کو بے نقاب کیا گیا ہے، وہاں مقامی ثقافت کے ساتھ مقامی زبان کو بھی متبادل ثقافتی بیانیہ کا حصہ بنایا گیا ہے۔ سلیمی بھی زبان کی ثقافتی اہمیت سے بخوبی آگاہ ہیں اس لیے اپنے دونوں ناولوں بالخصوص 'جندر' میں مقامی زبان کے الفاظ کو کثرت سے تخلیقی بیانیہ کا حصہ بنایا ہے۔ تاہم مقامی زبان کے الفاظ کو اس ہنرمندی سے ناولاتی فضا کا حصہ بناتے ہیں کہ یہ الفاظ اردو زبان کے حسن کے ساتھ معنوی کائنات میں بھی اضافہ کا باعث بنتے ہیں۔

دونوں ناولوں کے لوکیل کے طور پر ہزارہ کے دیہی علاقوں کا انتخاب اور پھر یہاں کی تہذیبی و ثقافتی زندگی کی تمام رنگارنگی اور نیگی کو جزئیات کے ساتھ تخلیقی عمل کا حصہ بنانا بھی سلیمی کے رواستعماری رویوں کا عکاس ہے۔ دونوں ناولوں میں تہذیبی و ثقافتی زندگی کے ساتھ ساتھ ان علاقوں میں صدیوں سے رائج لوک قصوں، کہانیوں اور اساطیر کو بھی اجاگر کیا گیا ہے کیوں کہ یہ سب ہمارا ثقافتی ورثہ ہیں اور ان کی بازیافت ضروری ہے۔ تاکہ یہاں کے مقامی باشندوں کے ذہنوں میں موجود نوآبادیاتی اثرات کو کم کیا جاسکے اور اپنی تہذیب و ثقافت کو اجاگر کر کے اس کی اہمیت کو دو چند کیا جاسکے۔ ان اقدار پر اعتبار بڑھ سکے تاکہ ذہنی غلامی سے نجات حاصل ہو۔ ولی خان اپنے بیٹے راہیل کے برعکس اپنی تہذیبی و ثقافتی اقدار و علامات سے جڑا ہوا ہے۔ ایسا مقامی باشندہ ہے جو نئی ثقافتی یلغار سے مرعوب نہیں بلکہ اس کے لیے پرانی اقدار ہی زندگی کا کل اثاثہ ہیں۔

آئیے اب ایک اور زاویے سے سلیمی کے ناولوں کے دونوں مرکزی کرداروں کا تجزیہ کرتے ہیں۔ سلیمی کے دونوں ناولوں کے مرکزی کردار اپنی خاندانی روایات کے تناظر میں انفعالی کردار ہیں۔ ان کے جد امجد بہادر، مضبوط، غیور اور خاندانی عزت و وقار کی خاطر مر مٹنے والے تھے۔ ان کرداروں کے خاندانی پس منظر سے سلیمی کی کسی باطنی یا ذہنی ضرورت کا خاص رشتہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس عمل میں سلیمی کے شعوری انتخاب کو

بہت کم دخل ہو اور ان کی ذہنی تخلیقی ساخت میں کچھ محرکات ایسے ہوں جو ارادی یا غیر ارادی طور پر ان کو اس طرح کے بہادر جنگجو آرکی ٹائپ کرداروں کی طرف لے جاتے ہوں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسانی خصوصیات سے متصف یہ کردار سلیمی کے پسندیدہ کردار ہیں۔ اور وہ خود ان سے تطبیق کر کے کسی مضر تشخص کا اظہار کرتے ہیں۔ ایسے جنگجو کردار ان کے ناولوں میں ابھرتے ہیں جو غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل اور غیور تھے لیکن اُن کی آنے والی نسلوں میں وہ بہادری، شجاعت اور خودداری جو ان کرداروں کے خاندان کی پہچان تھی، معدوم ہو چکی ہے۔ وہ خاندان جو بہادروں اور سورماؤں کا خاندان تھا، جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی جرات رکھتا تھا اور موت ان کی آنکھوں میں خون دیکھ کر خوف زدہ ہو کر بھاگ جاتی تھی۔ آج متذکرہ بالا بیشتر صفات اس خاندان میں معدوم ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ کردار معاشرے کے فعال کردار نہیں رہے۔ ممکن ہے ان مرکزی کرداروں کی تخلیق کے دوران سلیمی کے لاشعور میں کہیں یہ بات بھی رہی ہو کہ ہمارے اسلاف چوں کہ اپنی ثقافت، تہذیب، اپنے ماضی (شاندار ماضی) اور اپنی مٹی سے جڑے ہوئے تھے اور غیروں کی تہذیب و ثقافت ان کے لیے ثانوی حیثیت رکھتی تھی۔ اس لیے وہ لوگ فعال تھے اور انھوں نے بھرپور زندگی بسر کی۔ ان کی سادگی میں بھی ایک شان تھی جبکہ موجود نسل اپنے شاندار ماضی، اسلاف کے کارناموں، اپنی ثقافت اور روایات سے دور ہو چکی ہے۔ اپنی جڑیں خود ہی کاٹ دی ہیں اور غیروں (استعماری طاقتوں) کی ثقافت، تعلیم، تاریخ اور اقدار سے متاثر ہے اس لیے اس نسل کی فعالیت فعالیت میں بدل چکی ہے۔ یہ دونوں مرکزی کردار چوں کہ نئی نسل کے نمائندہ ہیں شاید اس لیے انفعالی رویے کے حامل ہیں۔

زمان اور ولی خان کے جدا محض کردار نہیں ہیں، نہ ہی یہ ٹائپ ہیں بلکہ ان کے پیچھے ثقافتی معانی کی پوری کائنات تہ در تہ موجود ہے۔ یہ خوددار اور بہادر کردار ایک طرح کا 'نفسی نقش' (Psychic Imprint) ہیں جن سے سلیمی کا ذہن عبارت ہے اور اس کی فن کاری جس کے بغیر مکمل نہیں۔ یوں سمجھیے کہ یہ آرکی ٹائپ گویا سلیمی کے ذہن و شعور و لاشعور میں کھدا ہوا ہے یا سلیمی کی سوچ اس کے تصور میں ڈوبی ہوئی ہے۔ سلیمی جب بھی اپنے تخلیقی باطن کی زبان بولتے ہیں یعنی جب وہ اپنے فن کی 'مادری زبان' میں گفت گو کرتے ہیں تو یہ آرکی ٹائپ خود بخود روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جس سے ناولاتی فضا جگمگا اٹھتی ہے۔ مردانگی، طاقت، بہادری، انا، عزت نفس، نیک دلی، بے نیازی اور فیاضی سب اسی کی جہات ہیں جو قبل تاریخی رشتوں سے آنے والی روشنی کے نشان ہیں یعنی نسلی سائیکس کا یہ اظہار ذہنی رشتوں میں رچا بسا ہے۔ ان کرداروں کے ساتھ ساتھ فطرت کا یہ منظر نامہ، یہ کھیت کھلیان، پہاڑ، وادیاں، جھیل، برف باری، لیتریاں اور تعصبات و توہمات بھی سلیمی کی فن کاری کے تانے بانے میں بجائے

خود ایک کردار ہیں اور ناولوں کے منظر نامے کو ایک خاص ثقافتی معنویت بھی عطا کرتے ہیں۔ سلیمی کا پیرایہ اظہار ان سب چیزوں میں اس طرح گندھا ہوا ہے کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

حواشی

- ۱۔ ہیری شاپیرو (Harry L. Shapiro)، ”ثقافت کا مسئلہ“ (Aspects of Culture)، مترجم: سید قاسم محمود، (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۷ء)، ص ۱۶۔
- ۲۔ ڈینیل بوتھ (Danial Butt)، *Colonialism and Postcolonialism*، مشمولہ *International Encyclopedia of Ethics*، (برطانیہ: ولی بلیک ویل: ۲۰۱۳ء)، ص ۲، آن لائن اشاعت: <https://philpapers.org/rec/BUTCAP-3>
- ۳۔ فرانز فینن الیجریا کے ایک اسپتال میں نفسیاتی معالج کے طور پر منسلک رہے۔ ان کا شمار مابعد نوآبادیاتی فکر کے بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے نوآبادیاتی باشندوں پر مابعد نوآبادیاتی حکمرانوں کی پالیسیوں کے نفسیاتی و ثقافتی اثرات کا مطالعہ کیا اور پھر نتائج کو اپنی تصانیف میں پیش کیا۔ اردو میں ان کی دو کتب ”افتادگانِ خاک“ مترجم: محمد پرویز اور سجاد باقر رضوی اور ”ثقافت اور سامراج“ مترجم: خالد محمود ایڈووکیٹ) ترجمہ ہو چکی ہیں۔ ”افتادگانِ خاک“ اس لحاظ سے بہت اہمیت کی حامل ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد ہی علمی دنیا میں ردِ استعماری کلامیوں کی بنیاد پڑی۔ فینن کا اختصاص یہ ہے کہ اس نے نوآبادیاتی صورت حال کو معروضی سیاق میں دیکھتے ہوئے ردِ استعماری کلامیوں کو اہمیت دی۔
- ۴۔ ایڈورڈ سعید کا تعلق ایک خوش حال فلسطینی عیسائی گھرانے سے ہے۔ ادبی حلقوں میں ایڈورڈ سعید کی شہرت مابعد نوآبادیاتی فکر کے بنیاد گزار کی ہے۔ انھوں نے نوآبادیاتی فکر کو بے نقاب کرنے کے لیے کئی کتب تصنیف کیں۔ ان کی دو سب سے اہم کتب ”شرق شناسی“ مترجم: محمد عباس اور ”ثقافت اور سامراج“ مترجم: یاسر جواد) اردو میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ ”شرق شناسی“ مابعد نوآبادیاتی فکر کے نظریاتی پہلوؤں اور ”ثقافت اور سامراج“ مشرق و مغرب کے نوآبادیاتی و مابعد نوآبادیاتی متون کے عملی تجزیوں پر مبنی ہے۔
- ۵۔ ناصر عباس نیر، ”مابعد نوآبادیات: اردو کے تناظر میں“، (کراچی: اوکسفر ڈ، ۲۰۱۶ء)، ص ۶۲
- ۶۔ رالف فاکس (Ralph Fox)، ”ناول اور عوام“، (The Novel and the People)، مترجم: سید محمود کاظمی، (لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء)، ص ۱۰۷
- ۷۔ جندر پتھر کے پاٹوں سے بنی ہوئی آٹا پیسنے کی مشین ہے جسے پہاڑی زبان میں جندر اور کشمیری میں گریٹھ کہا جاتا ہے۔ جندر (Water Mill) تیزی رفتاری کے ساتھ بہنے والے ندی ناولوں کے ساتھ بنائے جاتے ہیں۔ یہ پتھر کے دو گول اور بھاری برکم پاٹوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ جندر کے نیچے لگے ہوئے پتھر پانی کی تیز دھار سے حرکت میں آتے ہیں۔ اور اس کے اوپر والا حصہ ایک مخصوص رفتار سے چلتا ہے جو پتھر کے بڑے بڑے پاٹوں کو چلاتا ہے جس سے آٹا پستا رہتا ہے۔ جب کہ پریشکر ہونے کی صورت میں اس کی رفتار کم ہو جاتی ہے۔ یہ جندر کشمیر، پکوال، ہزارہ اور دیگر پہاڑی علاقوں میں موجود ہیں لیکن بجلی سے چلنے والی چکیوں کی آمد کے باعث یہ اپنی اہمیت کھو کر لوگوں کی زندگیوں سے باہر ہونے لگے ہیں۔ جندر ماشی قریب تک ہماری ہماری تہذیب و ثقافت کا حصہ رہے ہیں لیکن اب تیزی سے معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔
- ۸۔ اختر رضا سلیمی، ”جاگے ہیں خواب میں“، (راولپنڈی: رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء)، ص ۷۱، اشاعت سوم
- ۹۔ ایضاً ص ۷۸

- ۱۰۔ ایضاً، ص ۸۳
- ۱۱۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر، *The Indian Musalman*، (W W Hunter)، (نئی دہلی: روپا اینڈ کمپنی، ۲۰۰۲ء)، ص ۱۳۶ بحوالہ ”ثقافتی شناخت اور استعماری اجارہ داری“ از ناصر عباس نیر، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء)، ص ۳۳
- ۱۲۔ ہیری سپیرو، ”ثقافت کا مسئلہ“، ص ۴۰
- ۱۳۔ اختر رضاسلمی، ”جاگے ہیں خواب میں“، ص ۲۲
- ۱۴۔ اختر رضاسلمی، ”جندر“ (راولپنڈی: رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء)، ص ۲۲-۲۱، اشاعت اول
- ۱۵۔ ایضاً، ص ۳۹

ماخذ

- ۱۔ بٹ، ڈینیل (Butt, Danial)، *Colonialism and Postcolonialism*، مشمولہ *International Encyclopedia of Ethics*، (برطانیہ: ویلیک ویل، ۲۰۱۳ء)، آن لائن اشاعت: <https://philpapers.org/rec/BUTCAP-3>
- ۲۔ سپیرو، ہیری (Harry L. Shapiro)، ”ثقافت کا مسئلہ“ (Aspects of Culture)، مترجم: سید قاسم محمود، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۷ء
- ۳۔ سلمی، اختر رضا، ”جاگے ہیں خواب میں“، راولپنڈی: رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء، اشاعت سوم
- ۴۔ _____، ”جندر“، راولپنڈی: رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء، اشاعت اول
- ۵۔ فاکس، رالف (Fox, Ralph)، ”ناول اور عوام“، (The Novel and the People)، مترجم: سید محمود کاظمی، لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء
- ۶۔ نیر، ناصر عباس، ”مابعد نوآبادیات: اردو کے تناظر میں“، کراچی: اوکسفرڈ، ۲۰۱۶ء
- ۷۔ ہنٹر، ڈبلیو ڈبلیو (Hunter, W W)، *The Indian Musalman*، (نئی دہلی: روپا اینڈ کمپنی، ۲۰۰۲ء) بحوالہ ”ثقافتی شناخت اور استعماری اجارہ داری“ از ناصر عباس نیر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء
